(۲)

علامہ اقبال — بحضور آدم

از روئے قرآن خدا نے آدم کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ، نفخ روح بھی ذہن میں رہے ۔ پیمان الست بھی ، یہ بھی کہ خدائے خلاق نے وجود آدم میں اپنی جانب کشش کا جوہر ودیعت کر دیا ، تو آیا پھر آدمی ایک مجبور محض مخلوق تھا ملائکہ کی طرح کہ بس حکم ماننے اور تعمیل کرنے اور اس کے سوا کچھ کر ہی نہ سکے ، اگر ایسا ہوتا تو پھر یقیناً فرشتوں کا وجود کافی تھا اور یہی فرشتوں نے بحضور خدا التجا بھی کی تھی کہ ہم ہر دم تسبیح ، تقدس اور تحلیل کے لیے موجود ہیں ۔ خدائے تعالیٰ "یفعل مایرید" ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ، آیا آدم کو بھی مایرید کا کوئی پر تو نصیب ہوا ؟ یقیناً ہوا اور یہ من مانی کر گزرنے کی اہلیت اللہ نے آدم کو خصوصی شان اور امتیازی آن کے طور بخشی اور اسی میں اس کا سب سے بڑا امتحان بھی پوشیدہ تھا ۔ یہاں ذہن اس آیۂ کریمہ کی طرف لوٹ جاتا ہے :

انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا و حملھا الانسان انہ کان ظلوماً جھولاً ۔[۱]

"ہم نے (یہ) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے رکھی، تو ان سب نے انکار کیا اس سے کہ اسے اٹھائیں اور وہ اس سے ڈرے ، مگر آدمی نے اسے اٹھا لیا ، بیشک وہ بڑا ظالم ہے ، بڑا جاہل ہے ۔"

مولانا عبدالماجد دریا آبادی اس آیۃ کریمہ کی تفسیر میں ابن کثیر کے حوالے سے حضرت حسن بصری[۲] کا قول نقل کرتے ہیں ۔ ساتوں آسمانوں اور عرش سے خطاب ہوا کہ تم یہ امانت اور جو کچھ اس میں ہے اٹھاؤ گے ؟ عرض کیا اس میں کیا ہے؟ ارشاد ہوا نیکی پر اجر و ثواب اور بدی پر مؤاخذہ و عذاب ۔ اس پر سب نے عذر کر دیا۔ پھر اسی طرح زمین سے پھر پہاڑوں سے خطاب ہوا۔[۳]

مراد یہ کہ اختیار دے دیا جائے گا اس شرط پر کہ ہر فعل خیر کے باب میں ثواب عطا ہوگا اور ہر فعل شر کے ضمن میں مؤاخذہ و عذاب عمل میں آئے گا - ظاہر ہے کہ مجازاً زمینوں ، آسمانوں ، پہاڑوں اور کوہستانوں کا ذکر کیا گیا، بلندیوں پر بسنے والوں اور پستیوں پر آباد بڑے سے بڑے با شوکت وجودوں کو مسؤلیت اور ذمہ داری کی شرط کے ساتھ اختیار قبول کرنے کا یارا نہ تھا - صاف یہ بتانا مقصود تھا - کائنات میں آدم کے سوا کسی وجود میں وہ جوہر ودیعت نہیں کیا گیا جسے اختیار کہتے ہیں - اس الوہی شان کا پر تو اسی وجود کو عطا ہو سکتا تھا جس میں اس کے تحمل کی ہمت از روئے فطرت رکھی گئی تھی -

علامہ راغب اصفہانی کہتے ہیں امانت سے مراد کلمۂ توحید ہے - یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد عدالت ہے - یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد حروف تہجی ہے ، یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد عقل ، اور یہی بات صحیح بھی ہے اس لیے کہ حصول عقل ہی سے معرفت توحید حاصل ہوتی ہے - عدالت بھی عقل ہی کی بدولت عمل میں آتی ہے اور حروف کا علم بھی عقل ہی کے باعث میسر آتا ہے بلکہ عقل ہی کے حصول کی خاطر اس سب کچھ کا علم حاصل کیا جاتا ہے جس کا حصول آدمی کے بس میں ہے اور اسی کی وجہ سے آدمی کو کارخیر پر قدرت حاصل ہوتی ہے اور اسی سبب سے آدمی کو کثیر مخلوق پر فضیلت دی گئی -[۳]

اور ظاہر ہے کہ عقل ہی کی بدولت فعل خیر و شر میں امتیاز روا رکھنے کی ذمہ داری بھی آن پڑتی ہے، حصول علم اور پھر حسب مقدور علم مسئولیت، حلال و حرام ، مستحب اور منکر کے مابین تفریق کرنے کی اہلیت وہ جوہر ہے جو کسی دوسری مخلوق کو اس طرح میسر نہیں جس طرح انسان کو میسر ہے میزان عقل کے پاس ہے ، مگر بات عقل کی تمیزی قابلیت پر ختم نہیں ہو جاتی - تمیز خیر و شر کے بعد فیصلہ کن قوت عقل نہیں ، عقلی دلیل کافی نہیں ، فیصلہ کن عنصر آدمی کا منہ زور جبلی تقاضا ہے یا اٹل ارادہ ہے آدمی اس پر قادر ہے کہ جبلت کے وحشی اور بے لگام گھوڑے کو عقل کی رائے ، عزم اور ارادہ کی قوت سے قابو میں لائے اور قابو میں رکھے- اور یہ بھی ممکن ہے آدمی ساری دانش و بصیرت کے باوصف سرکش جبلت کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور عقل فریاد کرتی رہ جائے ، آدمی کار خیر کی جملہ قابلیتوں کے باوصف شر کا ارتکاب بھی کرتا ہے ، اس لیے کہ اس میں یہ اہلیت

ودیعت شدہ ہے۔ وہ شر کی جملہ گرشمہ سامانیوں کے باوجود اس سے کنارہ کشی بھی اختیار کر لیتا ہے اس لیے کہ اس میں یہ صلاحیت بھی فطری جوہر کی طرح موجود ہے ، لہٰذا آدمی سے نیکی بھی عمل میں آ سکتی ہے اور وہ بدی کا ارتکاب بھی کر سکتا ہے ، اس کے مقابل حیوان ارتکاب جرم و گنہ کر ہی نہیں سکتا ، اسے جو کچھ کرنا ہے فقط جملتوں کے بل بوتے پر کرنا ہے ۔ لہٰذا وہ مسئولیت کے زیر بار نہیں ، حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

"غزالی اور بیضاوی نے تنبیہہ کی ہے کہ امانت مکلف ہونے کی ذمہ داری ہے اس طرح پر کہ اطاعت اور نافرمانی احکام سے ثواب یا عذاب کا استحقاق ہو سکے ۔"[۴]

حضرت شاہ ولی اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ :

مکلف ہونے کے قابل وہی چیز ہو سکتی ہے جس کا کمال بالقوۃ ہو ، نہ بالفعل ۔"[۵]

عباس محمود العقاد کہتے ہیں :

"و بھذہ الا بمانۃ ارتفع الانسان مکانا علیا فوق مکان الملئکۃ لانہ قادر علی الخیر و الشر فھو فضل علی من یصنع الخیر لانہ لا یقدر علی غیرہ ولا یعرف سواہ ۔"[۶]

"اسی امانت کی بدولت آدی بلندی پر پہنچا اور فرشتوں سے بھی بلند تر مقام کو جا لیا اس لیے کہ وہ خیر پر بھی قادر ہے اور شر پر بھی لہٰذا اسے فضیلت ہے اس پر جو فقط کار خیر کرے اس لیے کہ خیر کے سوا کسی امر پر قادر ہی نہ ہو بلکہ خیر کے سوا کچھ جانتا ہی نہ ہو ۔"

غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ خلاق العالمین نے آدم کو یہ اختیار دے کر گویا بہت بڑا خطرہ خریدا ، ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ خلاق العلیم نے بنو آدم پر بہت بڑا بھروسا کیا ۔ خیر تو وہی ہے جو بالا رادہ اور سوچی سمجھی خیر ہو ، جبری یا فقط جبلی خیر صحیح معنوں میں عمل خیر قرار نہیں پا سکتی۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں :

"دراصل خیر میں جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ خیر کا مطلب ہے آدمی کا برضا و رغبت کسی اخلاقی نصب العین کی پیروی کرنا

جس کا دار و مدار پھر اس بات پر ہے کہ وہ انا جن کو اختیار کی نعمت حاصل ہے برضا و رغبت ایک دوسرے سے تعاون کریں، اس لیے کہ وہ ہستی جس کے اعمال و افعال کل کی طرح متعین ہیں خیر کی اہل کیسے ہو سکتی ہے ، آزادی خیر کی شرط اولین ہے ، یہ دوسری بات ہے کہ ایسے نفوس متناہیہ کی آفرینش جن کے سامنے عمل کا ایک نہیں کئی راستے ہوں اور ہر راستے کی اپنی اپنی قدر و قیمت ، ایک بہت بڑا خطرہ ہے - کیونکہ ہم ان میں سے جس راستے کو چاہیں اختیار کر سکتے ہیں - لیکن اگر انسان خیر کا انتخاب کر سکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس کی ضد یعنی شر کا انتخاب کر لے ، لہٰذا اگر مشیئت ایزدی یونہی تھی کہ اس طرح کا خطرہ برداشت کر لیا جائے تو اس سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ خدا کو اپنے بندوں پر کس قدر اعتماد ہے - اندریں صورت انسان کا بھی فرض ہے کہ اس اعتماد میں پورا اترے -"[۷]

بہرحال افراد بقدر وسعت اپنے اعمال و کردار کے ذمہ دار ہیں - وہ پہلو جو نفخ روح والا ، فطرۃ اللہ اور علم الاسماء ، نیز امانت والا پہلو ہے وہ مادی پہلو سے برسر پیکار رہتا ہے مگر یہ مرحلہ بھی اس وقت آتا ہے جب آدمی کسی قدر خود آگاہ ہو کر خیر و شر میں فرق کو جاننے لگتا ہے ، پھر نتیجہ یہ کہ کبھی وہ بلندی کی طرف جاتا ہے کبھی پستی کی طرف لڑھکتا ہے - وہ اہل ہمت کم بلکہ بہت ہی کم ہوتے ہیں جو اپنے پوشیدہ جوہر اختیار کو اس طرح بروئے کار لائیں کہ اپنی شخصیت کے روشن پہلو کو تاریک پہلو پر فیصلہ کن انداز میں حاوی کیے رکھیں -

عباس محمود العقاد کی رائے میں :

"انما أحجی أن یقال ان الانسان قنطرة من الارض الی السماء ینبیها الله — قنطرة قرارها اسفل سافلین و ذروتها اعلی علیین -"[۸]
"مناسب تر ہوگا یہ کہنا کہ انسان اللہ تک پہنچانے والا پل ہے جو زمین سے آسمان تک چلا گیا ہے اس پل کو اللہ نے تعمیر کیا ہے اس پل کا پایہ اسفل سافلین ہے اور چوٹی اعلیٰ علیّین - درحقیقت عباس محمود العقاد نطشے کے اس قول پر رائے زنی کر رہے تھے کہ آدمی بندر اور خدا کے مابین پل کا کام دیتا ہے -"[۹]

ڈاکٹر یوسف حسین خان نے عبدالکریم الجیلی کے حوالے سے بیان کیا ہے :

"انسان بجائے خود ایک عالم ہے جو خدا اور فطرت دونوں کا مظہر ہے ، انسانی ہستی ذات باری کی خارجی شکل ہے ۔ بغیر انسانی وجود کے ذات مطلق اور کائنات فطرت میں رابطہ قائم نہیں ہو سکتا انسان ان دونوں وحدتوں میں اتصالی کڑی کا حکم رکھتا ہے ۔"[۱۰]

مقالے کا آغاز ہی "احسن تقویم" کے حوالے سے ہوا تھا ، حد مقابل ہے اسفل سافلین"۔ عباس محمود العقاد نے یہی بات کہی ہے ، آدم کو ایک ایسے پل سے تشبیہ دے کر جس کا پایہ پاتال ہو اور چوٹی عرش معلیٰ —اگر آدمی نوری پہلو کی تربیت کرتا چلا جائے تو بلند تر ہوتا چلا جائے اور اگر خاکی پہلو سے چپک کر رہ جائے تو گرتا چلا جائے ۔ بے لگام جبلتوں کا بے بس رہین و اسیر—مگر جان اور جسم ایک دوسرے کا امتحان ہیں اور دونوں میں حسین ربط ایک خوبصورت وحدت ہے اور تصادم وحدت شکن ۔ حضرت علامہ اس باب میں لکھتے ہیں :

"لہٰذا انسان عبارت ہے حسن وحدت سے ۔ جب اس کے اعمال و افعال کا مشاہدہ عالم خارجی کے حوالے سے کیا جائے تو ہم اسے بدن لیکن جب ان کی حقیقی غرض و غایت اور نصب العین پر نظر رکھی گئی تو روح کہیں گے ۔ گویا بہ حیثیت ایک اصول عمل توحید اساس ہے حریت مساوات اور حفظ نوع کی ۔"[۱۱]

آدمی کے اس اختیار بدن و روح کی ہمسائگی اور اس کے اثرات و عواقب کا ذکر چل نکلے تو بات جنت سے ہبوط آدم تک پہنچتی ہے — خبر یہ ہے کہ آدم کی جنت یعنی کسی باغ خداوندی میں رہائش تھی اور اسے ہر طرح کے پھل اور میوے کھانے کی اجازت تھی ۔ البتہ اسے ایک پودے کے قریب پھٹکنے سے منع کر دیا گیا :

"ولا تقربا هذه الشجرة فتكونا من الظالمين ۔"[۱۲]

"مگر اس پودے کے قریب نہ جانا ، اگر ایسا کرو گے تو اپنی حد سے گزر جانے والوں میں شمار ہو گے ۔"[۱۳]

فوسوس لهما الشيطان ليبدي لهما ما ووري عنهما من سو آتهما ۔

گویا آدم اور حوا شیطان کے بہکانے میں آ گئے اور کچھ کر گزرے جس سے منع کیا گیا تھا — وہ شجر ممنوعہ کیا تھا ؟ اس ضمن میں اہل رائے نے مختلف آرا پیش کی ہیں لیکن چونکہ خود اللہ میاں نے رمز سے کام لیا ہے اور بالوضاحت کچھ نہیں بتایا لہذا بقول حافظ :

چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

اس مورد میں حضرت علامہ کی بھی رائے ہے اور وہ یہ ہے -

"شیطان نے اسے ورغلایا کہ علم خفی کے شجر ممنوعہ کا پھل چکھیے- اور آدم اس کے ورغلانے میں آ گیا - اس لیے نہیں کہ شر اس کی سرشت میں داخل ہے - بلکہ اس لیے کہ وہ فطرۃً عجول ہے ، وہ چاہتا ہے کہ علم کی منزلیں جلدی طے کرے - لہذا اس کا یہی رجحان ہے جس کو صحیح راستے پر ڈالنے کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ اس کی پرورش کسی ایسے ماحول میں ہو جہاں دکھ درد کی تکلیف کے باوجود اسے اپنی ذہنی قوتوں کے اظہار کا موقع ملتا رہے -"[۳]

اس امر کی مزید وضاحت علامہ کے کلمات ذیل میں ملتی ہے :

—لہذا قرآن مجید نے ہبوط آدم کا ذکر کیا تو یہ بیان کرنے کے لیے نہیں کہ کرۂ ارض میں انسان کا ظہور کس طرح ہوا ، اس کے پیش نظر حیات انسانی کا وہ ابتدائی دور ہے جب اس پر جبلی خواہشات کا غلبہ تھا اور جس سے گزر کر اس نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ وہ اپنی ذات میں آزاد اور اس لیے شک اور نافرمانی دونوں کا اہل ہے - مختصراً یہ کہ ہبوط کا اشارہ کسی اخلاق ہستی کی طرف نہیں - اس کا اشارہ اس تغیر کی طرف ہے جو شعور کی صاف اور سادہ حالت میں شعور ذات کی اولین جھلک سے اس نے اپنے اندر محسوس کیا - وہ خواب فطرت سے بیدار ہوا اور سمجھا کہ اس کی حیثیت خود بھی اپنی جگہ پر ایک سبب کی ہے ، یوں بھی قرآن مجید میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ کرۂ ارض ایک دارالعذاب ہے جہاں انسان جس کا خمیر ہی بدی سے اٹھایا گیا ہے ، کسی اولین گناہ کی پاداش میں قید و بند کی زندگی بسر کر رہا ہے ، برعکس اس کے اس کی پہلی نافرمانی وہ پہلا اختیاری عمل تھا جو

اس نے اپنے ارادے اور اپنی مرضی سے کیا اور یہی وجہ ہے کہ ارشاد قرآنی کے مطابق آدم کا یہ گناہ معاف کر دیا گیا ۔"[۱۵]

آدم نہ فرشتہ تھا نہ حیوان کہ جبلت کے دائرے سے باہر از رونے فطرت قدم نہ رکھتا ، آدم کی فطرت جسے خدا نے اپنی فطرت کا پر تو قرار دیا خود آگاہ ہونے کے بعد من مانی کرنے سے باز نہ رہ سکا ۔ چنانچہ شجر ممنوعہ سے بے تکلفی کر گزرا ، لہذا یاد دہانی کی گئی کہ تمہیں اس بات سے منع کیا گیا تھا، ساتھ ہی بتا دیا گیا کہ اب خود آگاہ ہو جانے کے بعد تمہارا آئندہ میدان عمل یہ جگہ نہیں رہنی چاہیے ۔ اب اپنی مرضی کی پرورش کے لیے ایسے ماحول میں جاؤ جہاں اپنی فطرت کے آزاد پہلو کو اجاگر کر سکو ، ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ آدم و حوا جنت میں کتنا عرصہ آباد رہے ، عالم کے تکوینی امور کے ضمن میں ہمارے کیلنڈر کام نہیں دیتے ۔ لہذا ظن و تخمین سے بات نہیں بنتی ۔

بہرحال آدم کو ایک نئے ماحول کے سپرد کر دیا گیا ۔ آدم کو پرانا ماحول چھوڑتے وقت یقیناً افسوس ہوا ہو گا اور اس کی یاد ایک خلش بن کر ستاتی رہی ہوگی ، یہی نہیں ، یہ حسرت آئندہ نسلوں میں لازماً منتقل ہوتی ہوگی ۔ حضرت علامہ کے بقول :

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
خلش سی ہے جو سینے میں غم منزل نہ بن جائے[۱۶]

گومشیت ایزدی کا تقاضا یہی تھا کہ آدم اپنے امکانات ذات کو بروئے کار لانے کے لیے محنت و مشقت کے طلبگار ماحول میں رہے مگر آدم و حوا کو نافرمانی کا شعور یقیناً پریشان بلکہ پشیمان کرتا رہا قرآن اس امر پر گواہ ہے کہ آدم و حوا نے التجا کی ۔

"ربنا ظلمنا و ان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین" ۔

"اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر بے حد زیادتی کی ، اگر تو مغفرت سے نہیں نوازے گا اور رحم نہیں کرے گا تو پھر ہمارا شمار اہل خسارت میں ہو کر رہے گا ۔"[۱۷]

ایک گھر سے نکل کے دوسرے گھر کی طرف سفر اختیار کرتے وقت ، گھبراہٹ جھنجھلاہٹ اور خوف وغیرہ عناصر کا طبیعت پر حاوی ہونا قدرتی

اور فطری امر تھا ، تاہم آدم کو جسے "انی جاعل فی الارض خلیفۃ" کا مشار الیہ بنایا گیا تھا زمین ہی کے لیے تیار کرنا مقصود تھا ، آخر اسے زمین سے کب تک دور رکھا جا سکتا تھا ، خدائے تعالے نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں جنت میں کوئی خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں لہٰذا جب امیر فطرت تسخیر فطرت کے لیے تیار ہوگیا تو حکم ملا اب چلو اور اپنا فرض منصبی سنبھالو ۔

صاف دکھائی دے رہا ہے کہ علامہ آدم کی نافرمانی کو بطور معصیت یا بغاوت اتنی اہمیت نہیں دے رہے ، جتنی خوشی انھیں اس نافرمانی کے جلو میں "اظہار خودی" کے احساس سے ہے آخر آدمی نے من مانی کر گزرنے کا آغاز تو کیا ؟ حضرت علامہ کے دل میں آدم کے اس آغاز ارتقا کے باعث مسرت چٹکیاں لیتی ہے جس کا مظہر "بال جبریل" کی یہ دو مشہور نظمیں ہیں "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں — روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" ——— پہلی نظم یہ ہے :

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی

سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی

گرانبہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے تیرے نخل کہن کی شادابی

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ ترے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی[۱۸]

اور "اب روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" یہ منظر ملاحظہ ہو :

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایام جدائی کے ستم دیکھ ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو ، معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ ، یہ صحرا ، یہ سمندر ، یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثر آہ رسا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنس محبت کا خریدار ازل سے
تو پیر صنم خانہ اسرار ازل سے
محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکب تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ

ان نظموں کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہ نے آدم کے جنت سے نکالے جانے کو وعید نہیں بنایا - اسے باعزت وداع کی صورت دے دی ہے اور زمین پر ورود کو تو استقبال مسعود بنا دیا ہے ، یہاں بھی وعید کا لہجہ نہیں ، عید کا ہے ، گویا حضرت علامہ خالق کون و مکاں کی تدبیر غالب کو روح آدم کی پرورش پر مرکوز جانتے ہیں ، تاکہ خلیفہ خدا ، مستخلف منہ کی شان کے شایاں ہو ، ہبوط آدم کے باب میں حضرت علامہ کے موقف کی تائید اور وضاحت کرتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم تحریر فرماتے ہیں :

"یہاں آدم کے ذکر کے بعد بھی پوری نوع بشر کو یہ صیغہ جمع خطاب کیا گیا ہے - اقبال کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ قرآن نے آدم

کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ کسی ایک فرد کا ذکر نہیں بلکہ نوع انسان کی نفسیات اور اس کے ممکنات کا بیان ہے ـــــ علامہ نظریہ ارتقاء کے قائل تھے لیکن یہ نظریہ ڈارونی نہیں تھا بلکہ عارف رومی اور حکیم برگساں کے نظریات کے مماثل تھا ، ان کا خیال تھا کہ نوع انسان ایک درجہ ارتقاء میں حیات کی ایک خاص منزل میں تھی جس سے اس کا نکلنا مزید ترقی کے لیے لازمی تھا ، اور متقیوں کے لیے جس جنت کا وعدہ ہے وہ اس جنت کی طرف عود نہیں جسے نوع انسان بہت پیچھے چھوڑ چکی ہے ، آئندہ زندگی کے پیکار اور تسخیر سے جو جنت حاصل ہو گی وہ پہلی جنت سے افضل ہوگی اور اس کے آگے جو جنتیں آئیں گی ان میں کہیں ایک حالت پر قیام نہ ہوگا "تخلقوا بأخلاق اللہ" کی سعی مسلسل ہر مرحلے میں جاری رہے گی ، ہر جنت ایک نئے انداز کا دارالعمل ہوگی، عمل اور زندگی ایک ہی چیز ہے، از روئے قرآن بھی تکریم آدم پہلی جنت سے نکلنے کے بعد ہی ظہور میں آئی - آدم پہلی جنت سے نکلنے کے بعد ہی خلیفۃ اللہ فی الارض بنا ، قرآن نے ہبوط آدم کو عروج آدم کا نظریہ بنا دیا - آدم کے متعلق عیسوی اور اسلامی نظریے میں یہ بنیادی فرق ہے - عیسائیت کے مطابق آدم کی نافرمانی کا گناہ اس کی فطرت میں پیوست ہو گیا خدا نے اسے معاف نہ کیا بلکہ سزا کے لیے پہلے دنیا میں بھیج دیا اور قیامت تک اس کی ذریت ناکردہ گناہ میں ملوث ہی پیدا ہوتی رہے گی اور ملوث ہی مرتی رہے گی ، یہ سزا کا لامتناہی سلسلہ حضرت مسیح کے کفارے پر ختم ہوا جس نے تمام بنی نوع انسان کے گناہ اپنی گردن پر لے لیے اور لعنت کی موت قبول- اب بھی فقط ان انسانوں کی نجات ہو سکتی ہے جو اس کفارے کے قائل ہوں ، ورنہ ناکردہ گناہ پیدائش آدم کی عصیانی وراثت کی وجہ سے جاری رہے گی ، قرآن نے آدم کی ایک سرسری لغزش کو معاف کرکے اسے انعام و اکرام کا مستحق بنایا جس کے بعد آدم کی اولاد میں سے ہر ایک معصوم پیدا ہوتا ہے اور زندگی اور اس کے بعد اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے ، کسی ایک فرد کا گناہ دوسرے کے ذمے نہیں لگتا ، لاتزر وازرۃ وزر أخریٰ ۔"[۲۰]

عباس محمود العقاد بھی ہر مسلمان مفکر کی طرح اسی نظریے کے مالک ہیں۔ وہ کہتے ہیں :

"فالاسلام لایعرف الخطئیہ الموروثۃ ولا یعرف السقوط من طبیعۃ الی ما دونھا فلایحاسب احداً بذنب أبیہ ولا تزر وازرۃ وزر أخری ۔"[۲۱]
پس اسلام موروثی گناہ کا قائل نہیں نہ اس کا قائل ہے کہ آدم کو اس کی فطرت سے کمتر درجے کی فطرت پر اتار دے اور نہ کسی کا محاسبہ اس کے باپ کے گناہ کے بدلے میں کرتا ہے اور (ظاہر ہے) کوئی جان کسی دوسری جان کا بار (بار گناہ) نہیں اٹھاتی ۔

ہبوط آدم از روئے اسلام اولاد آدم کو کسی موروثی گناہ کا مرتکب نہیں بناتا اور نہ اولاد آدم کے گلے میں طوق مجرمیت ڈالتا ہے ، حضرت علامہ نے آدم کی اولین غفلت جمع نافرمانی کو اس کے حق میں خیر جانا ، یہی مشیت ایزدی بھی تھی کہ جب آدم کار زمین کی مشقتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائے اور اس میں عناصر آفرینش و بقائے عالم پر حکمرانی کا پر اعتماد ذوق نمودار ہو جائے تو اسے وہاں اُتار دیا جائے جہاں اس کے فطری جوہر چمکیں ۔ حضرت علامہ نے اپنی نظم میں جس کا عنوان ہے ۔ "روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" ۔ آدم کے بظاہر ہبوط اور بباطن صعود و عروج کا بڑی مسرت کے ساتھ ذکر کیا ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ آدم کو معناً بلندی سے پستی کی طرف نہیں پھینکا گیا بلکہ بلندیوں سے مزید بلندیوں میں لے جا کے اتار دیا گیا ہے ۔

حضرت علامہ نے اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں جانی کہ وہ جنت جس میں آدم کو ٹھہرایا گیا تھا اس سے کیا مراد ہے ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ میاں نے آدم کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا تھا نہ کہ جنت میں ، لہذا اسے زمین ہی میں آکے اپنے ممکنات آدمیت کو کمال تک پہنچانا تھا ۔ جنت میں رہتے رہنا اس کے منصب کا مقدر ہی نہ تھا ، آیا یہ ممکن ہے کہ وہ جنت یا باغ اسی زمین کا کوئی حصہ ہو جہاں آدم و حوا کو بلا مزد و مشقت معاش میسر تھی اور پھر جب انھوں نے وہاں پر پرزے نکالے تو انھیں مفت کی اور سہل زندگی والے ماحول سے نکال کر نئے ماحول میں ڈال دیا گیا ۔
—جناب شہیر نیازی لکھتے ہیں :

"Though after committing a sin and becoming naked, Adam and Eve were pardoned by God, the Merciful, but now they were advised (not admonished) to leave this beautiful garden situated on some ridge to live on the plains so that they may be able to till the earth to feed their progeny. The word which is used for their expulsion is "ahbatu" (اهبطوا) which means "going down" from a place to a lower one but it does not mean falling from heaven or anything like that — In the same sura this "ahbatu" (اهبطوا) is used in a manner which is explanatory enough when God said to the Jews, "Get you down into Egypt."[22]

شہیر نیازی صاحب نے کتاب کے عنوانی صفحے کے بائیں حصے میں یہ صراحت درج کی ہے :

"This book is the first in the world wherein the Quranic view about Earthly Paradise, where Adam and Eve lived, is proved to be a geographical fact."

جناب شہیر نیازی کی یہ مختصر سی کتاب بڑا دلچسپ مطالعہ ہے ۔ انھوں نے درجنوں حوالوں کے ساتھ اپنی بات واضح کی ہے اور بلاشبہ خاصی محنت سے کام لیا ہے ۔ بعض جگہ انھوں نے حوالوں کی جانب فقط اشارہ کر دینے پر اکتفا کیا ہے ۔ حوالوں کی عبارات کم کم نقل کی ہیں ۔ اگر وہ عبارات بھی نقل کر دیتے تو کتاب پوری کتاب بن جاتی اور مزید دلچسپ بھی ہوتی ۔ بہرحال انھوں نے آخری رائے کے طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آدم کی گم گشتہ جنت اسی ہمارے جہان آتش و آب و خاک و باد میں تھی اور اس برعظیم میں واقع تھی جسے افلاطون نے Atlantis نام دیا تھا اور جو بحر اوقیانوس میں غرق ہو گیا تھا۔

بہرحال آدم و حوا اپنی اولاد کے ہمراہ جن کی گنتی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں جنت سے نکال دیئے گئے اور جنت سے نکالے جانے کی یہ خلش اولاد آدم کے ان جملہ گروہوں اور معاشروں کے دلوں میں ہمیشہ کسی نہ کسی طرح زندہ رہی جو کسی بھی ایسے مذہب کے پیرو تھے جس کی اساس وحی تھی۔ حضرت علامہ کے کلام میں آدم کی اس ہجرت ، جلا وطنی اور غربت کے متعلق کئی

اشعار موجود ہیں ۔ ان اشعار کا ایک پہلو مضامین حسرت پر مبنی ہے اور دوسرا جنت سے نکالے جانے کے نتیجے میں اس جہان خاکی کی تعمیر و ترقی کے بارے میں ہے :

مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے ؟ تب و تاب جاودانہ[۲۳]

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد[۲۴]

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا[۲۵]

فضا تری مہ و پروین سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں[۲۶]

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاک زندہ ہے تو ، تابع ستارہ نہیں[۲۷]

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن[۲۸]

فرشتہ را دگر آن فرصتِ سجود کجا ست
کہ نوریان بہ تماشائے خاکیان مستند[۲۹]

خویش را آدم اگر خاکی شمرد
نورِ یزدان در ضمیر او بمرد[۳۰]

مقدر است کہ مسجود مہر و ماہ باشی
مگر ہنوز ندانی چہا توانی کرد[۳۱]

گفت یزدان کہ چنین است و دگر ہیچ مگو
گفت آدم کہ چنین است و چناں می بالیست[۳۲]

سابقہ اوراق میں ابلیس کی طرف اشارہ گزر چکا ہے کہ اس نے آدم و حوا کو ورغلایا ، بہکایا اور بظاہر ان کو جنت سے نکلوانے کا باعث بنا ۔ وہ آیۂ کریمہ پہلے درج کی جا چکی ہے جو فوسوس لھا الشیطان ۔ سے شروع ہوتی ہے ۔

یہ آیۂ کریمہ آدم کے باب میں شیطان کو دوبارہ کارفرما پاتی ہے ۔ پہلے وہ اس فرمانِ خدا کے ضمن میں نظر آتا ہے جس میں خدا نے فرشتوں کو آدم کے حضور میں سر ادب جھکانے کا حکم دیا تھا اور اس نے انکار کر دیا تھا ۔ دوسری کارروائی یہ تھی کہ آدم و حوا اور ان کی اولاد کو راحت و آرام کے اس ماحول سے نکلوایا جس میں انھیں بلامزد فراواں معاش میسر تھی ، حضرت علامہ کی نظروں میں جس طرح آدم کا جنت سے نکالا جانا تقدیرات سے بنرد آزمائی کی راہ کھلنا قرار پایا اور مشیئت ایزدی کا عطا کردہ انعام ٹھہرا اسی طرح حضرت علامہ شیطان کو بھی ایک نا گزیر آدم گر عنصر جانتے ہیں مگر کیا مشیئت الٰہی وہ راز نہاں تھی جسے شیطان جانتا تھا بقول حضرت علامہ :

اسے روز ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر
مجھے معلوم کیا وہ راز داں تیرا ہے یا میرا[۳۳]

پھر یہ بھی عیاں ہے کہ ابلیس کی خلقت میں بغاوت اور سرکشی کا جوہر خود خالق نے پیدا کیا تھا ، بقول حضرت علامہ :

مرا گوئی کہ از شیطان حذر کن
بگو با من کہ او پروردۂ کیست[۳۴]

حضرت علامہ کے نزدیک ابلیس کا وجود آدم کے لیے ایک مستقل امتحان اور دعوت مبارزت کی علامت ہے ۔ اس مورد میں مجھے ایک واقعہ یاد آیا اور وہ درج ہو جانا چاہیے ۔ یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے کہ کابل یونیورسٹی کے استاد ادبیات

غلام سرور خان گویا کی علامہ علاء الدین صدیقی کے یہاں دعوت عشائیہ تھی ، مرحوم ڈاکٹر بشیر احمد وائس چانسلر تھے ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر نیاز احمد (کیمیکل ٹکنالوجی) ڈاکٹر وحید (فیروز سنز لاہور) آقا بیدار بخت ، قاضی ظہیر الدین ، شیخ امتیاز علی ، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اور دیگر کئی علمی اکابر جمع تھے ۔ طلبہ میں سے میں اور میرے دوست محمد خورشید عاصم (جو حال ہی میں کیڈٹ کالج حسن ابدال سے ریٹائر ہوئے ہیں) مدعو تھے ، وہاں باتوں باتوں میں ڈاکٹر نیاز احمد نے جو ان دنوں کیمیکل ٹکنالوجی کے صدر شعبہ تھے ذکر فرمایا کہ وہ موسم سرما کی کسی شام حضرت علامہ کے یہاں حاضر تھے ۔ بات زندگی اور اس کے امتحانات سے متعلق چل نکلی ۔ حضرت علامہ نے فرمایا کہ امتحان کے بغیر آدمی کی صلاحیتوں کا ثبات و ارتقا ثابت نہیں کیا جا سکتا ۔ امتحان اہلیتوں کو سند عطا کرتا ہے ، لہٰذا امتحان اور آزمائش ایک طرح سے اللہ کی رحمت ہے ، پھر بقول ڈاکٹر نیاز احمد حضرت علامہ نے شیطان کا ذکر کیا کہ اگر شیطانی وساوس اور ابلیسی حیلے نہ ہوتے اور اس طرح آدمی کو اپنے عقیدے، ایمان ، اصول اور نیک ارادے کو امتحان میں ڈالنے کا موقع نہ ملتا رہتا تو اسے کس طرح معلوم ہوتا کہ اس کا ایمان صادق ہے اور وہ واقعی کسی پختہ عقیدے اور اصول کا مالک ہے، بغیر شیطان کے آدم کی اہلیت اور اس کے امکانات پروان نہ چڑھتے ، ڈاکٹر نیاز احمد کا بیان ہے کہ یہ سن کر میں نے عرض کیا حضور والا اس طرح تو پھر شیطان بھی آدمی کے حق میں اللہ کی رحمت ٹھہرا ، برجستہ فرمایا بالکل درست ہے ، مگر یہ بات مولوی کو نہ بتانا ۔

آخری جملہ جیسا کہ عیاں ہے ، حضرت علامہ کی ظرافت مزاج کا مظہر ہے ، ورنہ جس امر پر انھوں نے زور دیا ہے وہ امتحان و آزمائش کا لزوم ہے اور شیطان ایک مسلسل امتحان ہے ۔ ایک مسلسل دعوت مبارزت ، جس کی بدولت آدمی کی ایمانی و اصولی بلندی و پستی واضح ہوتی رہتی ہے ۔ آدم کی جملہ اخلاقی اور روحانی فتوحات دراصل ابلیس کی ہزیمت کا اعلان ہیں ۔ ابلیس کے بغیر حیات آدم روحانی اعتبار سے بے ولولہ ہوتی ۔ اس لیے کہ اس میں دعوت مبارزت اور چیلنج نہ ہوتا ، نہ مقابلہ نہ ولولہ ، بے مقابلہ و ولولہ فتح میں سرشاری کی روح کیونکر پیدا ہوتی ۔ جبھی تو حضرت علامہ نے فرمایا تھا :

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزدان دارد و شیطان ندارد[۳۵]

اور یہیں یہ نقطہ بھی بطور یقین سامنے آ جاتا ہے کہ حضرت علامہ کو اگر وہ جہاں قبول نہ تھا جہاں یزداں تو ہو مگر شیطان نہ ہو تو یقیناً وہ جہاں بھی قبول نہ تھا جہاں فقط شیطان ہو اور یزداں نہ ہو——واضح ہے کہ ابلیس کے بارے میں حضرت علامہ کا رویہ اور نقطۂ نظر عام روائتی روئیے اور نقطۂ نظر سے قدرے مختلف ہے ، پروفیسر تاج محمد خیال لکھتے ہیں :

"In Javid Nama. he (Iqbal) enquired from Sayyid Hamadani about the nature of good and evil and to why evil was created. Sayyid Hamadani replied that association with Satan leads to man's fall, but struggle with Satan leads to man's perfection. Human personality is a sword that needs a whetstone to be sharpened. This whetstone is Satan and evil, and without them human porsonality cannot find its full growth and expansion."

بزم با دیو است آدم را وبال
رزم با دیو است آدم را جمال

خویش را بر اہرمن باید زدن
تو ہمہ تیغ ، او ہمہ سنگ فسن

تیز تر شو تا فتد ضرب تو سخت
ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت [۳۶]

جناب بشیر احمد ڈار ملٹن کے حوالے سے تقریباً وہی بات کہتے ہیں جو ایک طرح سے حضرت علامہ کے پیش نظر تھی ۔ یعنی ہبوط آدم کے ضمن میں شیطان کا کردار درحقیقت آدم کے لیے پوشیدہ نعمت تھی :

"Satan reduced Eve and Adam, and thereby became a means not of inflicting any punishment on mankind by driving them out of paradise to this hell of earth but of untold blessings in the form of giving them an opportunity to exercise freedom of choice by which man has the opportunity to create paradise within — happier farre."[37]

وہی بات جو پہلے بیان ہو چکی ہے کہ :

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں

اور

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزدان دارد و شیطان ندارد

حضرت علامہ شیطان کو "خواجہ اہل فراق" قرار دیتے ہیں ۔ یعنی وہ وجود جو بارگاہ ایزدی سے دور ہٹا دیئے جانے والوں کا سربراہ ہے ، سب سے بڑا راندۂ درگاہ ۔ مگر "خواجہ اہل فراق" کہہ کے عاشقوں کی نظر میں اسے کسی قدر قابل ہمدردی بنا دیا ۔ بلکہ کچھ احترام کا بھلاوا پڑتا ہے اور کیوں نہ ہو ، وہ وجود جس نے آدم کی داستان کو رنگ و آہنگ عطا کیا اور جسے ایک مستقل امتحان اور چیلنج کے روپ میں آدم کی ناگزیز ضرورت بنا دیا گیا ہو اور پھر اس ناگزیر ضرورت کے پردے میں اسے آدم کے حق میں ایک طرح سے عملاً رحمت کا ذریعہ بنا دیا گیا ہو اس کے حق میں کسی قدر ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنا کوئی ایسا ناموزوں عمل بھی نہ تھا ۔

اور تو اور حضرت علامہ ابلیس کے ہاتھوں اولاد آدم کے بے بس ہو جانے کی کیفیت پر ابلیس ہی کو نوحہ کناں دکھاتے ہیں ، ابلیس بنو آدم کے ناپائدار ایمان اور ڈھلمل عزم پر ماتم کرتا ہے ، اس کی خواہش ہے کہ اولاد آدم اس قدر محکم الایمان ہو جائے کہ دنیا میں ابلیس کی شکست اتمام کو پہنچے اور پھر اس کی یہاں ضرورت ہی نہ رہے تاکہ پھر وہ بحضور خدا ملتجی ہو سکے کہ اب آدم میرے بس کا نہیں ، اب میرا وجود یہاں کسی کام کا نہیں ، ایک آدم زاد کو گمراہ کرنے کے باب میں مایوس ہو چکا ہوں چنانچہ اولاد آدم کو گمراہ کرنے کا جو اجازت نامہ میں نے لیا تھا وہ بیکار ہو کر رہ گیا ہے لہٰذا میرے مولا مجھے اب واپس میرے مقام پر لوٹا دے ۔ یہ مضمون "میری کوریلی" کے مشہور و معروف ناول *Sorrows of Satan* کا مضمون ہے ، ابلیس کا دکھ یہ ہے کہ بڑے سے بڑا باعزم متقی بھی زود گسل ثابت ہوتا ہے ۔ ذرا سی بھی ابلیسی آنچ کا مقابلہ نہیں کر سکتا ، ذرا سا لالچ ، لذتیت کا ہلکا سا دام ، ذرا امکان جاہ کا جھانسا اور بو کاٹا ۔ نتیجہ یہ کہ ابلیس کی محنت

کا عرصہ پھیلتا جاتا ہے ، وہ گیا اور ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہ دیکھا قرآن کریم کا ارشاد ہے :

"واتل علیھم نبا الذی اتتناہ آیاتنا نسلخ منھا فاتبعہ الشیطان فکان من الغاوین ولو شئنا لرفعناہ بھا ولکنہ اخلد الی الارض واتبع ھواہ"۔ ۳۸

"اور آپ ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیے جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں مگر وہ ان سے ہٹ کر الگ ہو رہا ، پھر شیطان نے اسے پیچھے لگا لیا چنانچہ وہ گمراہوں میں داخل ہو گیا ، اگر ہم چاہتے تو ان نشانیوں کے ذریعے اس کو اوپر اٹھا لیتے لیکن وہ تو زمین کے ساتھ چپکا ہی رہا اور بدستور اپنی ہوس کا پیچھا کرتا رہا ۔"

اس آیہ کریمہ میں اللہ میاں کا بیان یہ اشارہ کرتا ہے کہ اللہ نے آدمی کو اپنی نشانیاں بتا دیں ، باقی ماننا نہ ماننا اس پر چھوڑ دیا ، خدا کو اگر خود اپنی مرضی کرنا ہوتی تو ان نشانیوں کے توسط سے اسے بلندیوں کی جانب اٹھا لیتا ۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب آدمی نے اللہ کی ہدایت نہ مانی تو شیطان نے تاکا اور اس پر اپنے داؤ آزمانے لگا، اب ظاہر ہے کہ خدا تو غالب و قادر ہے جب کہ شیطان غالب و قادر نہیں ، گویا حضرت علامہ کے حسب بیان صورت یہ ہے کہ :

"خدا اور شیطان دونوں انسان کو صرف مواقع فراہم کرتے ہیں اور پھر اسی پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ ان مواقع سے جیسا سمجھے فائدہ اٹھائے ۔" ۳۹

لیکن اولاد آدم ایسی ناخود شناس بلکہ خود گریز مخلوق ہے کہ شیطان سٹپٹا اٹھتا ہے اور بقول حضرت علامہ فریاد کرنے لگتا ہے کہ خدایا تجھے میری سابقہ طاعت و عبادت کا واسطہ مجھے اس نوع آدم سے بچا :

اے خداوندِ صواب و ناصواب
من شدم از صحبتِ آدم خراب

ہیچگہ از حکمِ من سر بر نتافت
چشم از خود بست و خود را در نیافت

خاکش از ذوق ابا بیگانہ
از شرارِ کبریا بیگانہ

صید خود صیاد را گوید بگیر
الامان از بندۂ فرمان پذیر

از چنیں صیدے مرا آزاد کن
طاعتِ دیروزۂ من باد کن

بندۂ صاحب نظر باید مرا
یک حریفِ پختہ تر باید مرا

ابن آدم چیست یک مشتِ خس است
مشتِ خس را یک شرر از من بس است

اندریں عالم اگر جز خس نبود
ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود

بندۂ باید کہ پیچد گردنم
لرزہ اندازد نگاہش در تنم

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست[۴۰]

حضرت علامہ خواہاں رہے کہ ابلیس کو بنو آدم کے ہاتھوں شکست نصیب ہو لہٰذا طعناً ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے کہ اے مولا میں آدم کے قرب کی وجہ سے برباد ہو رہا ہوں - ابلیس تو آدم کو ایک امتحان کی صورت میں درس جد و جہد اور تلقین تکمیل ذات کرتا رہا ، یہ آدم کا فرض تھا کہ ابلیس کو اپنے ایمان کے زیر اثر لاتا اور اسے باغی نہ رہنے دیتا - اپنے ایمان کی بدولت اسے مسلمان بنا دیتا -

خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں :

"ابلیس کوئی ایک شخصیت ہو تو وہ ایک وقت میں ایک جگہ عمل کرتی ہوئی نظر آئے ، لیکن حدیث شریف میں ہے کہ ہر شخص کے ساتھ اس کا شیطان لگا ہوا ہے - اس پر ایک صحابی نے ذرا جرأت

سے پوچھا کہ "کیا حضور کے ساتھ بھی" ؟ فرمایا ہاں میرے ساتھ بھی مگر میں نے اسے مومن بنا رکھا ہے - حضور کا شیطان تو مسلمان ہو گیا مگر کفار کے ساتھ لگا ہوا شیطان شیطان ہی رہا -"[۴۱]

اس مضمون کو حضرت علامہ نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے اور مطلب واضح ہے کہ ابلیس کے تابع ہو کر چلنے کے بجائے ابلیس کو اپنی راہ پر لگا لو - ابلیس کا اثر آدمی کے رگ و ریشہ میں راسخ ہوتا ہے اس کا قلع قمع کرنا مشکل کام ہے ، اپنے ایمان کی قوت کے باعث اس کی ابلیسیت کا مزاج اور پھر رخ بدلا جا سکتا ہے ، اس طرح رفتہ رفتہ ابلیس کی فرمائیشوں کو ایمان سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے یہاں تک کہ وہ مرد مومن کی پاکیزہ فطرت سے متوافق ہو کر رہ جائے اور آدم کے خلاف اس کی جنگ اختتام کو پہنچے :

کشتنِ ابلیس کارِ مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

کور را بینندۂ اسرار کن
بو لہب را حیدرِ کرار کن [۴۲]

مگر یہ تو جب ہو کہ آدم خود اپنے مقام سے آگاہ ہو ، جیسا کہ بارہا قبل ازیں بیان یا اشارہ ہوا کہ آدم کا ہبوط اس کی اپنی ذات سے غفلت میں مضمر ہے - یہ قطعہ پہلے درج کیا جا چکا ہے :

دلے چون صحبت گل می پذیرد
ہماں دم لذتِ خواہش بگیرد

شود بیدار چون من آفریند
چو من محکومِ تن گردد بمیرد [۴۳]

آدمی شاید اپنی حقیقی شان کو جاننے سے گھبراتا بھی ہے، اسے اپنی حقیقی حیثیت کا علم ہو جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اسی حیثیت کے تناسب سے زندگی بسر کرنا پڑے گی - بڑا بن کر جینا بعض ایسے مطالبے کرتا ہے جن کو پورا

کرنا بے پناہ بے آرامی سے ہمکنار ہونے کے مترادف ہے ، آدمی خاک سے پیدا ہوتا ہے اور بقول حضرت علامہ شروع شروع میں اس کے وجود کا مادی خلقی پہلو حاوی بھی رہتا ہے[۴۴] ۔ اس لیے وہ مٹی سے قریب رہنے میں سکھ محسوس کرتا ہے ۔ یہ جادی اور نباتی وجود ہے ، خاکستان سے دوری بے آرامی کا باعث بنتی ہے، حیوان کو حرکت کرنا پڑتی ہے ، رزق کی تلاش یا بچاؤ کی خاطر اپنی جگہ چھوڑنی پڑتی ہے ، دوڑ بھاگ ناگزیر ہوتی ہے ، تاہم حیوانی سطح بھی جبلی سطح ہے یا یوں سمجھئے کہ متحرک مشین کی سطح ہے ۔ رابطہ زمین ہی کے ساتھ رہتا ہے، زمین ہی میں خوراک ڈھونڈتا اور جیسی صورت میں ملے اسی صورت میں قبول کرتا ہے ۔ حیوان کے لیے حقوق و فرائض کے کوئی مسائل نہیں، گویا انسانی سطح جادی و نباتی سطح کے مقابل بے آرام ہونے کے باوصف بہت پر سکون ہے ۔ کوئی حیوان مرضی کا مالک نہیں ۔ اختیار خیر و شر اس کی ذمہ داری نہیں ۔ کوئی حیوان ارتکاب گناہ کر ہی نہیں سکتا ۔

حیوانی سطح پر رہنے والے انسان نما دو پایوں کے معاشرے میں جب کوئی فرد دوسروں سے بہت بلند واقع ہو تو دو صورتیں جلوہ گر ہوتی ہیں ، یا تو معاشرہ اپنے فرد کو فرید یا منفرد پا کر اس کا دشمن ہو جاتا ہے جیسا کہ پیغمبروں اور ہادیوں کے ساتھ ہوتا رہا یا فائق افراد کے بت بنا لیتا ہے اور پوجا کرنے لگتا ہے ۔

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل کے بقول :

> "وقت کے ساتھ ساتھ جوں جوں معاشروں کا ذہنی اوسط بلند ہوتا جاتا ہے توں توں فائق افراد کی استثنائی حیثیت کم ہونے لگتی ہے اور وہ دیوتا کی سطح سے اتر کر عام انسانی سطح سے قریب ہونے لگتے ہیں ۔"[۴۵]

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکابر کے وہ جوہر جو کبھی کرامات دکھائی دیتے تھے رفتہ رفتہ محض کمالات رہ جاتے ہیں ۔ ان میں کوئی عنصر خارق عادت یا غیر معمولی دکھائی نہیں دیتا ، غیر معمولی اعمال کو منظر عام پر لانا انسانی دسترس سے باہر نہیں ۔ فرق محض اتنا ہے کہ کسی آدمی کے یہاں یہ اہلیت زیادہ ہے کسی میں کم ، چونکہ فرد آدم کا کام عموماً حواس خمسہ ظاہری ہی سے چل جاتا ہے لہٰذا اسے اس سے آگے بڑھنا از راہ عادت پسند نہیں جس طرح کہ اب وہ سائنسی اوزاروں اور ہتھیاروں کا عادی ہوگیا اور بہت سے

معاملات میں اپنے جوہری قویٰ سے کام لینے کے بجائے آلات کا سہارا لیتا ہے۔ پہلے بہ چکھ کر دواؤں کے اجزائے ترکیبی بتا سکتا تھا اب تجزیے کے لیے مشین پر اعتماد کرتا ہے۔ پہلے محض دیکھ کر یا لمس سے بخار معلوم کر لیتا تھا اب تھرمامیٹر کا محتاج ہے۔ پہلے بڑی سے بڑی گنتی خود کر لیتا تھا اب کمپیوٹر کا محتاج ہے۔ گویا پہلے اپنے ظاہری حواس کا قیدی تھا اب ساتھ ہی ساتھ سائنسی اوزاروں کا بھی قیدی ہو کر رہ گیا ہے، بالفاظ دیگر یوں کہہ لیجیے کہ آدمی اپنے ہی بنائے ہوئے اوزاروں کے لیے خود ایک اوزار کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ یوں دیکھیں تو ماننا پڑتا ہے کہ سائنسی ایجادات نے آدمی کو اپنے فن سے مزید دور کر دیا ہے، اشیا کے برجستہ فہم کی اہلیت مزید پس پردہ چلی گئی ہے۔ پہلے نادر الوقوع کمالات کو کرامات کہہ دیا جاتا تھا اب سرے سے انکار کر دیا جاتا ہے اور انکار کی اساس یہ کہ ہماری سائنس یہ اور یہ نہیں بتاتی۔ انکار کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ سائنس کی مشینیں آدمی کی تخلیق ہیں جب کہ آدمی خدا کی تخلیق ہے، آدمی کو اللہ نے کسی ذرہ قدسی سے بھی نوازا ہے جسے محض روحانی قوت کی روشنی کے وسیلے سے دیکھا جا سکتا ہے، سائنس ایک ہتھیار ہے جو حواس خمسہ ظاہری کا مددگار ہے اور جس پر انحصار کرنے کے باعث خود حواس خمسہ ظاہری بھی اپنی جوہری اہلیت اور قابلیت کو کمزور کر لیتے ہیں۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں:

"ہم اپنے مقابل جس حقیقت سے دو چار ہوتے ہیں اس سے ربط و اتصال کا ایک طریق یہ ہے کہ اس کی آیات کے مشاہدے میں جیسا کہ ادراک بالحواس سے ان کا انکشاف ہوتا ہے، غور و فکر سے کام لیں اور یوں ان پر دسترس حاصل کرنے کی کوشش کریں، لیکن اس کا دوسرا طریقہ یہ ہو گا کہ حقیقت سے جیسا کہ اس کا انکشاف ہمارے اندرون ذات میں ہوتا ہے براہ راست تعلق پیدا کیا جائے، لہٰذا قرآن پاک کی فطرت پسندی محض اس امر کا اعتراف ہے کہ انسان فطرت سے وابستہ ہے اور یہ وابستگی چونکہ ایک امکانی ذریعہ ہے قوائے فطرت پر غلبہ حاصل کرنے کا اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس کا استعمال بے روح تغلب کی بجائے اس مقصد عظیم کے لیے کریں کہ ہمیں اپنی روحانی زندگی میں آزادی کے ساتھ مدارج کمال کی طرف بڑھنا ہے، یہی وجہ ہے کہ حقیقت مطلقہ کے تمام و کمال

بقا کی خاطر ادراک بالحواس کے ساتھ ساتھ اس چیز کے مدرکات کا اضافہ بھی ضروری ہے جسے قرآن پاک نے فواد یا قلب سے تعبیر کیا ہے ، قلب کو ایک طرح کا وجدان یا اندرونی بصیرت کہیے جس کی پرورش مولانا روم کے دلکش الفاظ میں نور آفتاب سے ہوتی ہے اور جس کی بدولت ہم حقیقت مطلقہ کے ان پہلوؤں سے اتصال پیدا کر لیتے ہیں جو ادراک بالحواس سے ماورا ہیں ۔"[۴۶]

آدمی محض مادی وجود نہیں، وہ بہت کچھ اور بھی ہے، اگر مادی وجود ہی ہوتا تو وہ خود اپنا خالق نہ ہونے کے باعث حواس ظاہری کی مدد سے ادراک ذات کی منزل تک نہ پہنچتا، حقیقت کا عرفان ، ذات خداوندی کی معرفت کے بغیر ممکن نہیں ، خدا کی کائنات کو خدا ہی کے عطا کردہ وجدان کی مدد سے جانا جا سکتا ہے - ورنہ "پردہ داری ہی پردہ داری ہے" اور یہ سلسلہ لایختم ہے Lincoln Barnot کا بیان ہے -

"He (man) does not understand the vast veiled universe with which he has been cast for the reason that he does not understand himself. He comprehends but little of his organic process and even loss of his unique capacity to perceive the world about him to reason and to dream. Least of all does he understand is his noblest and most mysterious faculty ; the ability to transcend himself and perceive himself in the act of perception."[47]

آدمی کی یہ اہلیت کہ وہ اپنی ذات سے بھی وراء اور بالا ہو سکتا ہے ، اسے اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنے ادراک کے عمل کا ادراک کر سکے ، وہ خود اپنے عمل کا جائزہ بھی لے سکتا ہے اور تجزیہ بھی کر سکتا ہے ، یہی نہیں خود اپنے مدرکات کی بھی چھان پھٹک کر سکتا ہے ، اس کا مطلب واضح ہے کہ وہ فقط مادی وجود نہیں ، اس کے خاکی پیکر میں کوئی اور شے بھی ہے جو اوپر سے تشریف لاتی ہے ، آدمی نہ صرف روح ہے نہ صرف بدن بلکہ روح و بدن دونوں سے برتر کوئی ہستی ہے ، اس لیے کہ وہ کہتا ہے میری روح ، میرا بدن ، میری جان ، میری دانش ، میری فکر ، میرا دماغ ، میرا دل ، میری دیوانگی ، میری حماقت و علی ہذا ، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ میں کون کہتا ہے ، اگر آدمی فقط روح ہے تو "میری روح" کے کلمات عرض کرنے والا کون ہے اگر آدمی جسم ہی ہے تو میرا جسم پکارنے والا وجود کون ہے ؟ یہ

"میں" یہ "انا" حقیقت ہے ۔ اس کا عرفان باہر کی طرف دیکھنے سے حاصل نہ ہوگا ، کچھ ملے گا تو اندر سے ، ازاں بعد باہر کے حوالے بھی توضیحی مددگار ثابت ہو سکتے ہیں ۔

حضرت علامہ فرماتے ہیں :

اگر گوئی کہ من وہم و گمان است
نمودش چوں نمودِ این و آن است

بگو با من کہ دارائے گمان کیست
یکے در خود نگر آں بے نشان کیست

جہان پیدا و محتاجِ دلیلے
نمی آید بفکرِ جبرئیلے

خودی پنہان ز حجت بے نیاز است
یکے اندیش و دریاب این چہ راز است

بہ خود گم بہرِ تحقیقِ خودی شو
انا الحق گو و صدیقِ خودی شوا [۴۸]

"اگر تو یہ جانتا ہے کہ "میں" ، "انا" فقط وہم و گمان ہے اور اس کا ظہور بھی صرف "این" اور "آن" کا مصداق ہے تو پھر مجھے یہ بتا کہ یہ صاحب گمان کون ہے ، یہ گمان کا اظہار کرنے والا کون ہے یہ بول کون رہا ہے ۔ تو ذرا خود اپنے اندرون میں جھانک کر دیکھ تاکہ پتہ چلے کہ وہ جس کا کوئی نشان نہیں وہ کیا ہے دنیا ظاہر ہے اس کے باوصف وہ اپنے اثبات کے لیے دلیل کی محتاج ہے اور وہ دلیل کسی جبریل کو بھی نہیں سوجھ سکتی لیکن خودی (انا) میں پوشیدہ ہو کر بھی دلیل سے بے نیاز ہے ۔ ذرا غور تو کر آخر یہ کیا راز ہے ؟ تحقیق خودی (یا حصول خودی) کے لیے اپنی ذات میں ڈوب جا ۔ اور پھر پورے یقین کے ساتھ انا الحق کا نعرہ لگا ۔ پورے یقین کے ساتھ اپنے ہونے کی صداقت کا اعلان کر ۔ یہ تصدیق خودی ، صدیق بن کے کر ۔"

واضح ہوا کہ حضرت علامہ کے نزدیک خودی من یا انا حق ہے اور اس کا عالم ظواہر سے کوئی تعلق نہیں اور لطف یہ ہے کہ من انا یا میں کی بات جس طرح ہم نے تشریح کے ساتھ ابھی اوپر بیان کی ہے اس ضمن میں لارڈ نارتھ بورن کی ایک تحریر جب نظر سے گزری تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ "من" یا "انا" یا "میں" کی دلیل انھیں بھی ویسی ہی سوجھی ، ان کے الفاظ میں :

"I am not anything that I can observe or feel or think about since observation, sensation and meditation imply a duality between myself and some subject that is myself. We commonly speak of my body or my soul as we speak of my feelings or my hand or my dog. I am certainly nothing that I can be said to possess. Then who or what is the "I" that says these things. It is not my body. It is not my soul—what am I ?" [49]

یہ معاملہ حق یہ ہے کہ لطیف بلکہ گریز پا ہے ، حضرت علامہ نے ایک اور مقام پر ماہیت آدم کو بیان کرنے کی بالفاظ ذیل کوشش کی ہے :

طلسم ہود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن

زمانہ صبح ازل سے رہا ہے محو سفر
مگر یہ اس کی تگ و دو سے ہو سکا نہ کہن

اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجود حضرت انساں نہ روح ہے نہ بدن[50]

یہ راز کسی دلیل و برہان سے نہیں کھلتا کہ ایک وجود جو روح کو بھی اپنی ملکیت بتائے اور بدن کو بھی ، عقل کو بھی ، دل کو بھی ، دماغ کو بھی ، حتیٰ کہ کہے میرا وجدان یہ کہتا ہے ، وہ وہی کچھ تو نہیں ہو سکتا جس کا وہ مالک ہے ، خدا نے انسان کو اتنا بڑا راز بنا دیا ہاں یہ الگ بات ہے کہ عقل اور اس کے دلائل اور ان دلائل کے پیدا کردہ یا ان دلائل کے محتاج فلسفے انسان کی حقیقت کو گرفت میں نہیں لا سکتے ، یہ اس کی وجدانی اور روحانی اہلیت ہے جو اسے نسبتاً قرب حقیقت بخش سکتی ہے لیکن یہ وجدان

اس حقیقت کے قریب فقط اس وقت پھٹک سکتا ہے جب وہ خدائے خلاق پر کامل یقین رکھتا ہو، اور اس کا پختہ اعتقاد ہو کہ وہ نور مطلق کے کسی کھربویں حصے کو یا اس کے پر تو کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے - وہی بات :

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است[۱]

یہ نور اگر آدمی کے حیوانی وجود سے مغلوب ہو جائے اور اس طرح عالم خلق کے مادی بوجھ تلے دب جائے اور دبا رہے ، تو وہ ایک عقلمند دو پایہ بن سکتا ہے اور دو پائے کی حیثیت سے خوش گفتار ، خوش خیال اور خوش فکر تو بن سکتا ہے ، بڑا عالم و فاضل اور محقق بھی کہلا سکتا ہے، مگر اسے خود اپنی ذات سے آگاہی میسر نہیں آ سکتی - اسے اپنی ذات سے آگاہی نور مطلق سے آگاہی کی بدولت ہی میسر آ سکتی ہے - بجا ہی تو فرمایا حضرت علامہ نے :

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ[۲]

مراد یہ ہے کہ آدمی کا من یا خودی یا ذات استحکام پذیر نہیں ہوتی جب تک وہ خدائے واحد پر ایمان نہ لائے اور دیگر ہر شے کی محبت یا خوف کے غلبے سے نجات نہ پالے اس لیے کہ اگر آدمی صرف مادہ نہیں ، صرف روح بھی نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ کوئی ایسی شے ہے جو جملہ کائنات سے بالا ہے۔ فقط خدا سے نیچے ہے - اور ظاہر ہے کہ اسے کوئی ایسی ہی شے ہونا بھی چاہیے تھا ، ورنہ وہ شے اس آیۂ کریمہ کا مخاطب کیونکر بن سکتی تھی :

"ولقد سخر نالکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعاً"

"ہم نے زمیں اور آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے" -

بہرحال حضرت علامہ عجب سرمستی کے عالم میں فرماتے ہیں :

ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخی فکر و کردار کا

یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

تو ہے فاتح عالم خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ
حقیقت ہے آئینہ ، گفتار زنگ

فروزاں ہے سینے میں شمع نفس
مگر تاب گفتار کہتی ہے بس

اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم [۵۳]

حواشی

۱ - قرآن حکیم ، سورہ ۳۳ ، آیت ۷۲ ، ۷۳ -

۲ - تفسیر ماجدی ، حاشیہ آیت ۷۲ ، ۷۳ ، سورہ ۳۳ -

۳ - مفردات معجم القرآن ، تقدیم مرعشلی، بیروت ، ص ۲۱ ، ۲۲ -

۴ - حجۃ اللہ البالغہ ترجمہ مولوی عبدالحق حقانی، قرآن محل کراچی ، ص ۴۵-

۵ - ایضاً ، ص ۴۶ -

۶ - حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ ، ص ۱۱ -

۷ - تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (دوسرا ایڈیشن) ، ص ۱۲۹ ، ۱۲۸ -

۸ - ایضاً ، ص ۱۳۱ -

۹ - ایضاً ، ص ۱۳۱ -

۱۰ - روح اقبال آئینۂ ادب لاہور ، ص ۲۰۴ -

۱۱ - تشکیل جدید (طبع دوم) ، ص ۲۳۸ -

۱۲ - قرآن حکیم ، سورہ ۲۱ ، آیت ۳۵ -

۱۳ - ایضاً ، سورہ ۷ ، آیت ۲۰ -

۱۴ - تشکیل جدید (دوسرا ایڈیشن) ، ص ۸۷ -

۱۵ - ایضاً ، ص ۱۲۸ ، ۱۲۷ -

۱۶ - کلیات اقبال (اردو) بال جبریل ، ص ۱۰ -

۱۷ - قرآن حکیم ، سورہ ۷ ، آیت ۲۳ -

۱۸ - کلیات اقبال (اردو) بال جبریل ، ص ۱۳۱ -

۱۹ - ایضاً ، ص ۱۳۲-۱۳۳ -

۲۰ - فکر اقبال (دوسرا ایڈیشن)، بزم اقبال، لاہور ، ص ۵۰۷ ، ۵۰۸ -

۲۱ - حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ ، ص ۱۰۹

22. *Adam and Paradise on Earth*, Saudabad, Karachi, 27, p. 26.

۲۳ - کلیات اقبال (اردو) بال جبریل ، ص ۱۴ -

۲۴ - ایضاً ، ص ۸ -

۲۵ - ایضاً ، ص ۶ -

۲۶ - ایضاً ، ص ۵۰ -

۲۷ - ایضاً ، ص ۴۴ -

۲۸ - ضرب کلیم ، ص ۵۷ -

۲۹ - کلیات اقبال (فارسی) زبور عجم ، ص ۱۰۹ -

۳۰ - ایضاً ، ص ۱۸۷ -

۳۱ - ایضاً ، ص ۶۴ -

۳۲ - ایضاً ، ص ۱۰ -

۳۳ - کلیات اقبال (اردو) بال جبریل ، ص ۶ -

۳۴ - کلیات اقبال (فارسی) ارمغان حجاز ، ص ۶ -

۳۵ - کلیات اقبال (فارسی) پیام مشرق ، ص ۱۳۲ -

۳۶ - *Studies in Iqbal's Thought and Art* ، بزم اقبال ، کلب روڈ ، لاہور ، کلیات اقبال (فارسی) جاوید نامہ ، ص ۲۷۶ -

۳۷ - ایضاً ، ص ۳۰۱ -

۳۸ - قرآن حکیم ، سورہ ۷ ، آیت ۱۷۵ -

۳۹ - شذرات فکر اقبال ، ترجمہ از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور ، ص ۱۵۲ -

۴۰ - کلیات اقبال (فارسی) جاوید نامہ ، ص ۲۲۵ - ۲۲۶ -

۴۱ - فکر اقبال (دوسرا ایڈیشن) ، ص ۵۰۱ - ۵۰۲ -

۴۲ - کلیات اقبال (فارسی) جاوید نامہ ، ص ۷۵ -

۴۳ - ایضاً ارمغان حجاز ، ص ۱۲۲ -

44. *Reconstruction*, 1944, pp. 193-96.

۴۵ - الایمان و المعرفۃ و الفلسفہ ، دارالمعارف القاہرہ ، ص ۱۳۶ ، ۱۳۷ -

۴۶ - تشکیل جدید ، ص ۲۲ ، ۲۳ -

47. *The Universe and Dr. Einstein*, Mentor books, 1954, p. 127.

۴۸ - کلیات اقبال (فارسی) زبور عجم ، ص ۱۷۰ ، ۱۷۱ -

49. *Religion in the Modern World*, Suhail Academy, Lahore, p. 75.

۵۰ - کلیات اقبال (اردو) ، ضرب کلیم ، ص ۵۷ -

۵۱ - ایضاً (فارسی) ، اسرار و رموز ، ص ۱۸ -

۵۲ - کلیات اقبال (اردو) ضرب کلیم ، ص ۱۵ -

۵۳ - کلیات اقبال (اردو) بال جبریل ، ص ۱۲۸ ، ۱۲۹ -
(۱۹۸۵)